اسلامی اجتماعیت

مقصدِ اجتماع

دنیا کا ہر منظم اجتماع اپنا کوئی نہ کوئی متعین مقصد رکھتا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ متعین مقاصد ہی اجتماعیتوں اور تنظیموں کو وجود میں لایا کرتے ہیں۔ اس لیے کوئی اجتماعیت بجائے خود مطلوب نہیں ہوتی، بلکہ کسی مقصد کے حاصل کرنے کا صرف ذریعہ ہوا کرتی ہے، اوراس کی جو قدر واہمیت بھی ہوتی ہے، اس مقصد کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اگر کسی تنظیم سے پیش نظر مقصد کا حاصل ہونا صحیح معنوں میں متوقع ہو، تب تو اسے جو قدر واہمیت بھی دی جائے کم ہے۔ لیکن صورت حال اگر یہ نہ ہو تو چاہے یہ تنظیم سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہی کیوں نہ ہو، ایک حقیر تنکے کے برابر بھی قیمت نہ پاسکے گی۔

یہ بات اگر دوسری تمام اجتماعیتوں اور تنظیموں کے بارے میں ایک مسلمہ حقیقت ہے تو اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کے سلسلے میں محض ایک خیال بن کر نہ رہ جائے گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے معاملے میں اس بدیہی اور مسلمہ اصولی حقیقت سے اختلاف کیا جاسکے۔ اس لیے عقل کہتی ہے کہ اس نے اپنے پیرووں کو جس اجتماعیت، جس وحدت اور جس تنظیم کی ہدایت فرمائی ہے، اس سے مراد مطلق اجتماعیت، بے قید وحدت اور تنظیم برائے تنظیم ہرگز نہیں ہوسکتی، بلکہ وہ لازماً ایک مخصوص قسم کی اجتماعیت، ایک خاص طرز کی وحدت اورایک بامقصد تنظیم ہی ہوگی، یقیناً کوئی نہ کوئی متعین مقصد ہوگا جس کی خاطر ہی لوگوں کو متحد اور منظم زندگی بسر کرنے کا یہ حکم دیا گیا ہے، نیز یہی مقصدوہ چیز ہوگی جو مسلمانوں کی کسی اجتماعیت اور تنظیم کے بارے میں یہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ وہ اسلامی اجتماعیت اور تنظیم ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس مقصد کے حاصل ہونے کا واقعی ذریعہ بن سکتی ہو تب تو اسے اسلامی اجتماعیت اور اللہ ورسولؐ کی پسندیدہ تنظیم قرار پانے کا حق ہوگا، اوردینی حیثیت سے وہ اس اہمیت کی مالک ضرور تسلیم کی جائے جس کی نشان دہی پچھلے اور آنے والے صفحات کر

رہے ہیں۔لیکن حقیقت واقعی اگر یہ نہ ہوئی، اور مسلمانوں کا یہ تنظیمی قافلہ اس مقصد کی طرف بڑھتا دکھائی نہ دیا تو اسے اسلامی اجتماعیت کہلانے کا کوئی حق نہ ہوگا، نہ اسے ان احکامِ دین کی پیروی سمجھا جائے گا جو ملی اجتماعیت اور تنظیم کے بارے میں دیے گئے ہیں۔اور اگر خدانخواستہ معاملہ اس حد سے بھی آگے بڑھا ہوا ہو، مسلمانوں کی یہ تنظیم اپنے بنیادی فلسفے اور اپنے فطری مزاج ہی کے اعتبار سے کچھ ایسی واقع ہوئی ہو کہ اس سے الٹی اسلامی اجتماعیت کے اصل مقصد کی راہ رندھتی ہو، اور اس کے ثمرات اس مقصد کے بجائے کسی اور ہی کی متاعِ مطلوب بنتے ہوں، تو یہ اگرچہ 'مسلمانوں' کی تنظیم ہوگی، مگر اسلام کے حق میں ایک لعنت سے کم نہ ہوگی، اور اس کے بارے میں اس کی خواہش صرف یہ ہوگی کہ اسے توڑ دیا جائے، اس کی موجودہ بنیادیں ڈھادی جائیں، اور اس کی جگہ وہ تنظیم بپا کی جائے جس سے اس کا مقصدِ اجتماع پورا ہوتا ہو۔

وہ مقصد کیا ہے جس کے لیے اسلام نے اپنے پیروؤں کو منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے؟ یہ سوال دراصل یہ سوال ہے کہ خود ان پیروان اسلام کا بحیثیت ایک ملت کے، مقصدِ وجود اور فریضہ منصبی کیا ہے؟ کیونکہ کسی ملت کا مقصدوجود یا فریضۂ منصبی ہی وہ چیز ہوتی ہے جس کے لیے وہ 'ملت' بنتی اور ایک متحد و منظم گروہ کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔اس لیے ملت اسلامیہ کا مقصدِ وجود اور فریضۂ منصبی معلوم کرلیجیے، اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کا مقصد واضح ہوجائے گا۔قرآن مجید نے اس سلسلے میں مختلف مواقع پر جو کچھ فرمایا ہے، وہ یہ ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ. (بقرہ:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک بہتر اُمت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے تمام لوگوں پر (حق کے) شاہد ہو۔''

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

(آلِ عمران۔۱۱۰)

''تم ایک بہترین اُمت ہو، جسے دوسرے سارے انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔''

دُوری اور بے تعلقی بنیادی اور فکری قسم کی ہوئی تو وہ یکسر غیر اسلامی اور خالص جاہلی اجتماعیت ہوگی، وہ اہل ایمان کی کافرانہ تنظیم ہوگی، وہ ایک ایسی جماعت ہوگی جس کے اُوپر خدا کا ہاتھ ہرگز نہ ہوگا۔

شیرازۂ اجتماع

اسلامی اجتماعیت کے مقصد کا یہ تعین اس کے شیرازے کا بھی تعین کر دیتا ہے۔ اگر اس اجتماعیت کا مقصدِ وحید صرف اللہ کے دین کی اقامت اور شہادت ہے، تو یہ اس بات کا بھی فیصلہ ہے کہ اجتماع کا مرکز صرف یہی دین اور صرف یہ دین ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو ایک متحد و منظّم گروہ بن کر رہنے کی ہدایت دیتے وقت جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا. (آل عمران:۱۰۳)

''تم سب مل کر 'اللہ کی رسی' کو مضبوطی سے پکڑ لو، اور ٹولیوں میں نہ بٹو''

یہ ارشادِ ربانی جس طرح اس باب میں بالکل صریح ہے کہ سارے مسلمانوں کو باہم جڑا ہوا رہنا چاہیے، اسی طرح اس بارے میں بھی کچھ کم صریح نہیں ہے کہ ان کو جوڑنے والی چیز صرف اللہ کی رسی ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن نے اہلِ ایمان کو جس متحد و منظّم اجتماعیت کا حکم دیا تھا اس کے لیے ناگزیر ٹھیرایا تھا کہ اس کی ہر اکائی اپنے 'کل' سے صرف اللہ کی کتاب کے رشتے سے، اور محض اس کے دین کی خاطر آ کر ملی اور جڑی ہو۔ اس کے سوا اس 'کل' کو 'کل' بنانے والا اور اس کے اجزا کو آپس میں جوڑنے والا کوئی اور رشتہ نہ ہو۔

ہدایت الٰہی کے اس متن کی شرح معلوم کرنا چاہیں تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل دیکھیں۔ یہ عمل، جیسا کہ ہر صاحبِ نظر جانتا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ آپؐ نے لوگوں کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا، آخرت یاد دلائی، اور ایک خدا کی بندگی کی دعوت دی۔ پوری زندگی یہی کرتے رہے۔ جو اس دعوت کو مان لیتا وہ اسلامی جماعت و اجتماعیت کا رکن بن جاتا، خواہ اس کی نسلیت، اس کی وطنیت، اس کی رنگت اور اس کی زبان کچھ بھی ہوتی۔ اور جو اسے نہ مانتا وہ اس جماعت کے قریب بھی نہ پھٹک پاتا، چاہے وہ قریشی اور ہاشمی ہی کیوں نہ ہوتا۔ جس طرح اس دعوت کے سوا

اور کوئی چیز نہ تھی، جس کی طرف آپؐ نے کبھی کسی کو بلایا ہو، اسی طرح اس رشتے کے سوا اور کوئی رشتہ بھی نہ تھا جس کے ذریعے سے کسی کو امت مسلمہ سے اُجڑنے کی آپؐ نے کوئی گنجائش رکھی ہو۔ ایسی کسی گنجائش کا کیا سوال، آپؐ نے تو اس طرح کی اجتماعیتوں اور جتھا بندیوں کے خلاف انتہائی سخت الفاظ کہے ہیں۔ چنانچہ 'الجماعۃ' یعنی صحیح اسلامی اجتماعیت سے پوری طرح وابستہ رہنے کی تلقین کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمَنْ دَعَابِدَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَمِنْ جُثٰی جَهَنَّمَ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ۔ (احمد و ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

''اور جس نے جاہلیت کی پکار پر لوگوں کو بلایا اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اگرچہ روزے رکھتا، نمازیں پڑھتا، اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔''

'جاہلیت' کے معنی ہیں اسلام کی ضد۔ یہ اتنی ہی واضح حقیقت ہے جتنی یہ بات کہ 'شرک' توحید کی ضد ہے۔ اس لیے ہر وہ پکار جاہلیت کی پکار ہوگی جو اسلامی نہ ہو، جس کو قرآن حق کی پکار تسلیم نہ کرتا ہو، جسے رسولؐ خدا کی زبان سے کبھی بلند ہوتے نہ سنا گیا ہو، اور جسے اللہ کے دین میں جواز کی سند حاصل نہ ہو۔ اسلام نے ایک منظّم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے، اور غیر جماعتی زندگی سے سخت بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص لوگوں کو اس اجتماعی نظم سے آزادی اختیار کر لینے کی طرف بلاتا ہے تو یہ ایک کھلا ہوا جاہلی بلاوا ہوگا۔ اسی طرح قرآن نے تمام مسلمانوں کو اللہ کی رسی کے شیرازے سے منسلک ہو رہنے کی وصیت فرمائی ہے۔ لہٰذا اگر اس کے بجائے کسی اور رشتے کو مرکز بنا کر انھیں اکٹھے ہونے کی دعوت دی جائے گی تو یہ قطعاً ایک جاہلی دعوت ہوگی، خواہ وہ خون کا، وطن کا، زبان کا، رنگ کا، غرض کوئی سا بھی رشتہ ہو۔ اس لیے حدیثِ رسولؐ میں جو دہشت بھری تنبیہ فرمائی گئی ہے، قدرتی طور پر اس کا دائرۂ اطلاق بہت وسیع ہے، اتنا ہی وسیع جتنا کہ 'جاہلیت' کا دائرہ وسیع ہے۔ اور اس دائرے میں جہاں دوسری چیزیں داخل ہیں وہاں یہ بات بھی داخل ہی ہے، اور شاید سب سے نمایاں طور پر داخل ہے کہ مسلمانوں کو

کسی ایسے 'کلمے' پر جمع ہونے کی، کسی ایسے رشتے سے آ بندھنے کی، اور کسی ایسے مرکز پر اکٹھے ہو جانے کی دعوت دی جائے جو اسلامی نہ ہو، یعنی اسلام نے اسے نوعِ انسانی کے درمیان امتیاز کی کوئی بنیادی اور حقیقی وجہ نہ تسلیم کیا ہو۔

ایک اور موقع پر اس حقیقت کے سمجھانے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّۃٍ. (ابوداؤد، کتاب الادب)

''نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے لوگوں کو کسی عصبیت کی طرف بلایا۔''

کسی عصبیت کی طرف بلایا، یعنی اسلام کی خالص عقلی اور اعتقادی بنائے اجتماع کو چھوڑ کر مسلمانوں کو اُن نسلی یا وطنی، لسانی یا کوئی تعصبات میں سے کسی تعصب پر جمع کرنے کی کوشش کی جن پر خدا فراموش اور مادّیت کی غلام قومیں بالعموم جمع ہوا کرتی ہیں۔

یہ ارشادِ نبویؐ بھی اس امر کی واضح شہادت ہے کہ اسلام اور کسی عصبیت کی طرف دعوت، یہ دونوں چیزیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔

غرض 'جاہلی پکار' اور 'عصبیتی دعوت' ایک نجاست ہے، اور اسلام کا ذوقِ لطیف اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ اغوائے شیطانی کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے اس طرح کی کوئی بات نکل گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوری نوٹس لیا، اور ذہنوں کو اس گندگی کے اثرات سے پاک کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر ایک مہاجر اور ایک انصاری میں جھگڑا ہوگیا۔ مہاجر نے انصاری کی پشت پر لات ماردی۔ انصاری نے ''یَا لِلْاَنْصَارَ'' (دوڑو اے انصار!) کی صدائے فریاد بلند کی۔ جواب میں مہاجر نے بھی ''یَا لِلْمُھَاجِرِیْنَ'' (پہنچو اے مہاجرو!) کا نعرہ لگایا۔ آپؐ کے کانوں تک یہ الفاظ پہنچے تو فرمایا:

مَا بَالُ دَعْوَی جَاھِلِیَّۃٍ؟ دَعُوْھَا فَاِنَّھَا مُنْتِنَۃٌ. (بخاری جلد دوم، کتاب التفسیر)

''یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی؟ دُور رہو اس سے، کیونکہ یہ بڑی گندی چیز ہے۔''

ظاہر ہے کہ ''یَالِلْاَنْصَارَ'' اور ''یَا لِلْمُھَاجِرِیْنَ'' کے الفاظ، جو دراصل نسلی اور وطنی نعرے تھے، صرف ایک وقتی جھگڑے کے سلسلے میں زبانوں سے اچانک نکل آئے تھے۔ کسی سوچے سمجھے فلسفے اور نظریے کے تحت کسی مستقل جماعت سازی کی دعوت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی رسولؐ خدا کو یہ الفاظ اتنے ناگوار گزرے گویا یہ الفاظ نہیں ہیں، بلکہ غلاظت کے کیڑے اور عفونت کے بھبکے ہیں، جنھیں کسی مسلمان کے منہ سے ہرگز نہ نکلنا چاہیے اور جنھیں ایمانی ذوق کی پاکیزگی ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتی۔

اگر ''جاہلیت'' اور ''عصبیت'' کی طرف بلانے والے کا وجود اسلامی معاشرے کے لیے بالکل ہیچ ہے اور وہ جہنم کا ایندھن ہے تو وہ شخص بھی، جو اس بلاوے پر لبیک کہتا ہے، ملت کا سرمایہ اور جنت کا مہمان نہیں بن سکتا۔ عقل اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کی بھی وہی حقیقت ہو جو اس جاہلیت اور عصبیت کے داعی کی بتائی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ''لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّةٍ'' فرمایا ہے، وہیں اس فیصلے کا بھی اعلان کر دیا ہے کہ:

وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِیَّةً وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰی عَصَبِیَّةٍ۔

''اور نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے کسی عصبیت کے تحت جنگ کی، اور نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے کسی عصبیت کی خاطر جان دی۔''

غرض دین کے سوا، دنیا کا کوئی تعلق، کوئی اشتراک اور کوئی رشتہ ایسا نہیں جس پر مسلمان بحیثیت مسلمان اکٹھے ہو سکتے ہوں، اور جو اسلامی اجتماعیت کا شیرازہ بن سکتا ہو۔ ایسی کسی چیز پر اگر مسلمان اکٹھے ہوں تو اس اجتماع کو جو چاہیے کہہ لیجیے، لیکن اسلامی اجتماعی ہرگز نہ کہہ سکیں گے۔ مذکورۂ بالا نصوص سے یہ حقیقت آئینہ کی طرح صاف ہو جاتی ہے۔

طریق اجتماع

اب اس بحث کا صرف ایک گوشہ اور باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ عملاً یہ اجتماعیت وجود میں کس طرح آتی ہے؟ ویسے تو گزشتہ دونوں امور کی وضاحت کے بعد اس سوال کا جواب معلوم

کر لینے کے لیے قیاس اور اندازہ بھی بالکل کافی ہے، مگر مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر مناسب یہی ہوگا کہ اس بارے میں بھی دین کی صریح ہدایتوں ہی پر اپنے اطمینان کی بنیاد رکھی جائے، نہ کہ صرف قیاس اور اندازے پر۔ اس غرض کے لیے جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دکھائی دیتا ہے کہ اس نے سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں کو ایک منظّم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی جو جامع ہدایت دی ہے اس کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ.

(آلِ عمران:۱۰۲)

''اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو، اور تمھیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم اللہ کے اطاعت گزار ہو۔''

اس کے بعد ''اور'' کہہ کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی وہ بات فرمائی گئی ہے جس کا حوالہ پچھلی بحث میں ابھی گزر چکا ہے۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہوا کہ ان لفظوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ اس ہدایت کی پہلی شق ہے، اور بعد کے لفظوں میں اس کی جو دوسری شق ارشاد ہوئی ہے اس کا وجود اسی پہلی کے وجود پر منحصر ہے۔ یعنی جس طرح اسلامی اجتماعیت ظہور میں نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کا دین ہی اس کا شیرازہ نہ ہو، اسی طرح دین مسلمانوں کی اجتماعیت کا شیرازہ ہرگز نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ فی الواقع ایمان والے نہ ہوں، تقویٰ ان کے سینوں میں گھر نہ کیے ہوئے ہو، اور اسلام (اللہ کی اطاعت گزاری) میں وہ سرگرم عمل نہ ہوں۔ اس اجتماعیت کا جز بننے، جز بنانے اور جز باقی رہنے کی یہ، اور صرف یہی لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اس جماعت کا رکن بننے کا اہل نہیں ہوسکتا، نہ اسے اس کا رکن بنایا جاسکتا ہے۔ جس شخص کے اندر یہ صفتیں جتنی ہی پختہ ہوں گی وہ اس جماعت کا اتنا ہی اچھا اور قابلِ اعتماد جز ہوگا اور اسی قدر زیادہ صحیح طریقے سے اس کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ اور جو ان باتوں میں جتنا ہی خام ہوگا جماعت کے ساتھ اس کی وابستگی بھی اتنی ہی ناپائدار اور ناقابلِ اعتماد ہوگی۔

پھر اس امرِ واقعی کا تقاضا جس طرح یہ ہے کہ صرف انھی لوگوں کو اس جماعت کا رکن مانا

جائے جو اللہ کے دین پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی پیروی کا عہد کریں، اسی طرح اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کے رکن بن چکے ہوں ان کے اندر ان صفات کے پروان چڑھانے اور پروان چڑھاتے رہنے کا پورا پورا اہتمام ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی جس ہدایت کا ہم اس وقت جائزہ لے رہے ہیں وہ صرف اتنے ہی لفظوں پر ختم نہیں ہوگئی ہے جن کے حوالے اوپر آ چکے ہیں، بلکہ آگے وہ یہ بھی کہتی ہے کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

(آل عمران:۱۰۴)

''اور چاہیے کہ تم وہ گروہ ہو جو بھلائی کی طرف بلاتا، نیکی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا رہے۔''

یہ دراصل اس ہدایت کی تیسری اور آخری شق ہے، جو ایک پہلو سے پہلی شق کا تکملہ بھی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ 'حبل اللہ' کے مرکز پر اکٹھے ہونے سے اہل ایمان کی جو جماعت وجود میں آئے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دائرے کے باہر بھی اور اس کے اندر بھی 'خیر کی دعوت' دیتی رہے، معروف کا امر کرتی رہے، اور جہاں بھی ایمان، اسلام اور تقویٰ کے تقاضوں کو پامال ہوتے دیکھے، روک بن کر سامنے کھڑی ہو جائے۔ صرف اسی شکل میں اس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اس جماعت کے افراد اُن صفتوں کے فی الواقع حامل باقی رہیں گے جن کا پایا جانا اس جماعت کی رکنیت کی بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ایک فرض 'تزکیہ' بھی تھا، اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس طرح اس بات کے ذمہ دار بنائے گئے تھے کہ لوگوں کو دین حق کی دعوت دیں اور جو افراد اسے قبول کرلیں انھیں اللہ کی آیتیں سنائیں 'کتاب (احکام الٰہی) کی تعلیم دیں، اور 'حکمت' (رُوحِ دین) سکھائیں (يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ) اسی طرح اس بات کے بھی ذمہ دار بنائے گئے تھے کہ اس دعوت کے قبول کر لینے والوں کے علم اور عمل اور اخلاق میں جو خامیاں پائیں ان کی اصلاح کرتے رہیں (وَيُزَكِّيْهِمْ، بقرہ:۱۲۹)۔ جو کچھ آپؐ کے فرائض منصبی میں داخل تھا، ممکن نہیں کہ آپؐ کا عمل ذرہ برابر بھی اس سے مختلف ہوتا۔ چنانچہ تاریخ کی پیشانی پر ہر شخص اس ابھری ہوئی

حقیقت کو نمایاں دیکھ رہا ہے کہ امت مسلمہ کی تشکیل کے سلسلے میں آپؐ نہ تو اس سے کم کسی بات پر راضی ہوئے، نہ اس سے زیادہ کسی چیز کے طالب بنے۔ آپؐ اللہ کے بندوں کو اسی کی بندگی کی طرف بلاتے۔ جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہتے صرف انھی کو امت کا جز بناتے۔ اور جن لوگوں کو امت کا جز بنا چکتے انھیں اپنے دامن تربیت میں لے لیتے۔ یعنی ان کے اندر ایمان، اسلام اور تقویٰ کا جوہر پروان چڑھاتے رہتے۔ یہی سب کا سب وہ کارِ نبوت تھا جس کے نتیجے میں اسلامی اجتماعیت اور اُمتِ مسلمہ وجود میں آسکی۔